غزلِ میر کا تلمیحاتی مطالعہ

مطلوب حسین

Matloob Hussain

Lecturer, Department of Urdu,
Govt. Post Graduate College, Sahiwal.

ماجد مشتاق

Majid Mushtaq

Lecturer, Department of Urdu,
Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

Mir Taqi Mir is a renowned poet of Urdu Classic Poetry. Poets like Ghalib and many more pay tribute to him in their poetic lines. Mir Taqi Mir known as "Khuda-e-Sukhan" for his contribution in urdu poetry with example for next generations. This article particularly throw light on the "Talmeehati" study of his poetry. This will help the reader to have an introduction of "Talmeeh" and its uses by Mir Taqi Mir.

اُردو غزل کو اصنافِ ادب میں وہی مقام و مرتبہ اور پذیرائی حاصل ہے جو کسی شادی بیاہ کی تقریب میں زرق برق لباس پہنے اور ہر کسی کا دل لبھاتی کو ملتا نظر آتا ہے لیکن اس اس جواز میں ایک کلیدی اور واضح فرق یہ ہے کہ کسی بھی عروسہ کا حسن شادابی اور پذیرائی کچھ مخصوص لمحات تک محدود ہوتی ہے اس کے برعکس غزل کی دلکشی کشش اور فسوں نہ صرف لافانی ہے بلکہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی دیدہ زیبی اور جادوگری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس امر کے پیچھے کئی محرکات ہو سکتے ہیں جیسے غزل کے مزاج پر بات کی جائے تو یہ ہر دور کے موضوع کو کم سے کم الفاظ میں اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے اس کا تکنیکی آہنگ ایسا دلفریب ہے کہ ہر مزاج آج عمر اور خطے کا قاری اس سے محفوظ ہوئے بنا نہیں رہ سکتا ہے یہ تکنیکی تار و پود کہیں تو تو بحور کے انتخاب میں تو کہیں قافیہ اور ردیف کی صورت میں اپنے ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے صنائع بدائع اور تلمیحات رنگا رنگی بھی اس کی شہرت میں دوگنا چگنا اضافہ کرنے کا باعث ہے لیکن ہمارا موضوع ج یہاں تلمیحاتی دائرہ کار میں رہتے ہوئے غزل میر کی استادانہ صلاحیتوں اور اس کی دل نشینیوں کا جائزہ لینا ہے۔

میر تقی میر کے دواوین اس امر کی دلیل ہیں کہ تلمیحات کا استعمال کلام کی رعنائی اور معنی آفرینی کو کیسے وسعت و انفرادیت عطا کرتا ہے لیکن ہم غزل میر کا تلمیحاتی مطالعہ کرنے سے مختصراً یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ آخر سے کیا مراد ہے اور

اس کے لئے کن اصولوں کو مدنظر رکھنا رکھا جاتا ہے۔ جامع اللغات میں تلمیح کے حوالے سے درج ہے:

''کسی چیز کی طرف سبک نگاہ سے دیکھنا اور اپنے کلام کو آیات واحادیث سے ثابت کرنا۔''(۱)

''نور اللغات'' میں تلمیح باب میں کچھ یوں رقم ہے:

''تلمیح (ع) مونث۔علم بیان کی اصطلاح کلام میں کسی قصے کی طرف اشارہ کرنا۔''(۲)

بحوالہ بالا دونوں لغات کی نسبت " مہذب لغات " تلمیح کی تفہیم کرنے زیادہ کارگر نظر آتی ہے مہذب لکھنوی کے بقول:

> تلمیح۔کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا۔علم بیان کی اصطلاح میں ایک صنعت کا نام ہے جس میں شاعر اپنے کلام میں کسی مشہور اور مسئلہ یا کسی قصہ یا مشہور مثل یا اصطلاح نجوم وغیرہ کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرے جس کے بغیر معلوم ہوئے اور بے سمجھے اس کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ نہ آئے۔''(۳)

میر کے اشعار میں مختلف اور متنوع تلمیحات کا استعمال کثرت سے بڑھنے کو ملتا ہے جن اشعار میں انھوں نے تلمیح کو برتا ہے ان اشعار کا سارا حسن وصفی ان تلمیحات کے مرہون منت نظر آتا ہے ایک شعر دیکھئے جس میں خضر کی تلمیح لا کر ایک طویل تاریخی واقعے کو کوزے میں بند کر دیا ہے:

ملا کہیں تو دکھا ویں گے عشق جنگل
بہت ہی خضر کو غرہ ہے رہنمائی کا(۴)

حضرت عیسٰی خدا کے برگزیدہ پیغمبر ہیں جن پر انجیل مقدس کا نزول ہوا اللہ تعالی کو چونکہ اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کرنا مقصود تھا اس لیے انہیں بغیر باپ کے پیدا خدا کیا حضرت عیسٰی کو خدا کی طرف سے بہت سے معجزات عطا کئے گئے جن میں میں مردوں کو۔قُم باذن اللہ۔ کہہ کر زندہ کرنا۔مٹی کے پرندے بنا کر ان میں جان ڈالنا۔ناامید مریضوں کو اکتسابی تدبیر سے شفا یا بی اور اور نابینا لوگوں کو بینائی عطا کرنا وغیرہ شامل ہیں اردو شاعری میں حضرت حضرت عیسٰی کی نسبت سے بہت سے تلمیحات رائج ہیں جو ایک طرف تو ان کی شخصیت کا اعلان ہے تو دوسری طرف صرف ان سے حضرت عیسٰی کی کرامات کو اجاگر کیا گیا ہے حضرت عیسٰی کی قم۔عیسٰی کی کرامت۔دم عیسٰی اور چرغ کا دم وغیرہ۔میر تقی میر نے بھی اپنے اشعار میں حضرت عیسٰی سے منسوب تلمیحات کو تواتر اور تکرار کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

اس تلمیح کے تناظر میں میر کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو انہیں اس امر کا کامل احساس ہے کہ وہ کسی عام دنیا دار شخص کو اپنے شعری قالب میں نہیں پرو رہے بلکہ وہ ایک ایسی ہستی ہے کہ جس سے خدا کو اس قدر محبت ہے کہ اسے ایسے معجزات سے نواز دیا جو عام انسان کے ادراک میں آتے ہی نہیں۔

دوسرا یہ کہ اس تلمیح کو اس فنی مہارت سے برتا گیا ہے کہ شعر کی معنی آفرینی اور پیش کش نہ صرف دو چند ہوگئی ہے بلکہ شعر سحر بن کر قاری کو اپنی گرفت میں لیتا نظر آتا ہے دیکھیے میر کس طرح حضرت عیسٰی کی مُردوں کو زندہ کرنے کی کرامت کو شاعرانہ پیکر میں ڈھالتے نظر آتے ہیں کہ قاری ایک لفظ عیسٰی کے استعمال سے اس سارے پس منظر سے آگاہ ہو جاتا ہے جو خدا نے اپنے نبی کو اپنی قدرت سے نوازا تھا:

خضر و عیسٰی کے تئیں نام جینا سن لو
جان ہے ورنہ کب اس کے کسو بیمار کے بیچ(۵)

''آبِ حیات'' کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا پینے والا حیات جاوداں حاصل کر جاتا ہے تاریخ میں اس کے حوالے سے کئی واقعات مشہور ہیں ایک روایت کے مطابق سکندر اور خضر عالمِ ظلمات آبِ حیات کی غرض سے گئے لیکن سکندر اس ظلمت کدے کی تاریکی میں بھٹک کر اپنی خواہش نہ پوری کر سکا جب کہ خضر نے نہ صرف آبِ حیات تک رسائی حاصل کی بلکہ اسے پی لیا اس لیے ان کا وجود اب تک قائم ہے۔

فارسی اور اُردو غزل میں اس تاریخی واقعے کو حقیقی اور فرضی کی بحث سے ہٹ کر ہر دور کے اہم اور عام شاعر نے اپنی استعداد کے مطابق اشعار میں پیش کیا ہے زیادہ تر اس کا مضمون محبوب کے کسی نہ کسی عمل سے جوڑا جاتا ہے میر نے بھی اس تلمیح کو کثرت سے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے میر کبھی تو آب حیات کی ستائش کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی انھیں محبوب کے کسی سراپا یا عمل سے موازنہ کروا کر نئے اور اچھوتے مضامین رقم کرتے:

نسبت تو دیتے ہیں تیرے لب سے پر ایک دن
ناموس دلوں میں جائے گی آبِ حیات کی(۶)

میر کی حیات کا مطالعہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ان کا مزاج آج عنائیت سے بھرپور تھا جس کا اندازہ اس دلیل سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام میں تعلّی کے اشعار اس تعداد میں موجود ہیں کہ ان پر ایک بھرپور مقالہ لکھا جا سکتا ہے میر نے آب حیات کی تلمیح کے حوالے سے بھی اس انانیت کی مضبوط تصویر کشی کی ہے۔ان کے خیال میں وہ چشمۂ حیات جس کے لئے سکندر ہر بے گھر و بے در ہوا میر کی خوددار پسند طبع تھا اسے خاطر میں ہی نہیں لاتی۔

اپنے جی ہی نے نہ چاہا کہ پئیں آبِ حیات
یوں تو ہم میر چشمے پہ بے جان ہوئے(۷)

طُور، شعلہ طُور، طُورِ سینا اور طُور کی تجلی یہ مختلف تلمیحات ایک ہی واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کا تعلق خدا اور موسٰی کے مابین ہونے والے مکالمے سے ہے ڈاکٹر شریف احمد قریشی کے بقول:

''طُور سریانی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں اس سے مراد طور سینا کوہِ سینا لیا جاتا ہے جہاں حضرت موسٰی نے خداوندی کا دیدار کیا تھا یہ پہاڑ بحرِ قلزم کے دو شاخے پر مصر کے راستے پر واقع بتایا جاتا ہے۔''(۸)

حضرت موسیٰ نے دیدارِ خدا کی خواہش کا اظہار کیا لیکن جب جلوہ الٰہی کا ظہور ہوا تو اس کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔شعر و ادب کی دنیا میں یہ تلمیح اکثر پڑھنے کو ملتی ہے جہاں شعرا اسے کبھی حقیقی تصور عشق کے رنگ میں لاتے ہیں تو کبھی محبوب مجازی کے حسن سے اسکو نسبت دی جاتی ہے میر تقی میر نے بھی اس تلمیح کو بڑے عمدہ انداز میں برتا ہے۔

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا
دل نے جگر کی اور اشارت کی یاں گرا(۹)

عشق کے مختلف تصورات اور واقعات اس نظامِ حیات کا ایسا منظر نامہ ہے جن کی صداقت سے انکار ممکن نہیں حضرت

زلیخا اور حضرت یوسف کے حوالے سے بھی نہ صرف تاریخ بلکہ قرآن پاک میں میں محبت کے ایک بھرپور واقعے کی تفصیل پڑھنے کو ملتی ہے جس میں اگرچہ کہیں کہیں عشق اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتا لیکن اس کے باوجود اس جذبے کی داخلی صداقت سے انحراف بھی کذب بیانی ہوگی اس واقعے سے بعدازاں کئی تلمیحات تربیت پاتی دیکھی جاسکتی ہیں مثلاً یوسف، یوسف اقبال اور چاہ، چاہ یوسف، یوسف مصر، یوسف مصری، یوسف زلیخا وغیرہ۔

کلاسیکی اور جدید شعرا نے اس واقعے کو کو علامت بنا کر محولہ بالا تلمیحات کو نئے نئے رنگوں اور دلفریب مضامین کی صورت میں اس طرح اشعار کا حصہ بنایا ہے کہ ایک طرف تو تاریخ سے وابستہ یوسف اور زلیخا کا واقعہ تازہ ہو جاتا ہے اس کے ساتھ شعرا اپنے جذبات و ناآسودہ خواہشات کا اظہار بھی احسن طریقے سے کر لیتے ہیں دیکھئے میر تقی میر نے اپنی داخلی کیفیات کو کس اچھوتا انداز سے یوسف زندانی تلمیح کے انداز میں بیان کر دیا ہے:

جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا
تنگ احوال ہے اس یوسف زندانی کا(۱۰)

حضرت یوسف کے ساتھ جو ان کے بھائیوں نے سلوک روا رکھا وہ کس سے ڈھکا چھپا ہے؟ حالی کے بقول آج بھی اس کنویں سے یہ آواز آتی ہے کہ اس دنیا میں مخلص دوست بہت ہی تھوڑے ہیں لیکن برادر یوسف بنا تلاش کیے ہی بے شمار مل جاتے ہیں۔ میر بھی اپنے مختلف اشعار میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہیں کیوں کہ وہ بھی اپنے سوتیلے بھائی کی کج ادائی اور دنیاداری کے ڈسے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے اشعار میں جہاں بھی یہ تلمیح یا مضمون آتا ہے پورے تاثر اور صداقت کے ساتھ ادا ہو کر حزن کی خالص ترین شکل اختیار کر لیتا ہے۔

قصہ نہیں سنا کیا یوسف ہی کا جو تو نے
اب بھائیوں سے چندے تو گُرگِ آتشی کر(۱۱)

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالی کے بتائے ہوئے راستے اور کفر و شرک سے نجات کے لئے اپنی قوم کی لگ بھگ ساڑھے نو سو سال تبلیغ کرتے رہے اس دوران ان پر طرح طرح کے ستم ڈھائے گئے۔ انھیں دین کی طرف بلانے اور پیغامِ حق پہنچانے کی وجہ سے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے استقلال میں کمی واقع نہ ہوئی۔ لیکن ان کی قوم اس قدر بھٹک چکی تھی کہ ایک طویل عرصہ صراطِ مستقیم کا درس ملنے کے باوجود صرف اسی لوگ ان کی باتوں اور ان کے ارشادات پر ایمان لائے تنگ آ کر حضرت نوحؑ نے خدا کے حضور اور ایسے لوگوں کی بربادی کی دعا کی جو کسی طور پر پر راہِ راست پر آنے کے لیے تیار نہ تھے نتیجتاً ایک ایسا شدید طوفان آیا کہ وہ سب کچھ ہی نیست و نابود کرتا چلا گیا سوائے ان کے جنھوں نے حضرت نوحؑ کے سایۂ عافیت میں پناہ چاہی اسی نسبت سے نوح علیہ السلام کو آدمِ ثانی بھی کہہ کر پکارا جاتا ہے میر تقی میر نے مبالغہ سے کام لیتے ہوئے اپنی آنکھوں کے سیلاب کو طوفانِ نوح کی تلمیح میں استعمال کر کے نوازنے کی دلچسپ صورت پیدا کی ہے۔

نوح کا طوفاں ہماری کب نظر پڑتا ہے میر
خوش ہم دیکھے ہیں کیا کیا دیدۂ تر کے ترے(۱۲)

دنیا اور معاملات دنیا پھولوں کی تسبیح نہیں بلکہ دکھوں کا گھر ہے جہاں کبھی غم روزگار دل گرفتگی کا سبب بنتا ہے تو کبھی غم جاناں کی حشر سامانیاں اور فراق کے حزیں تجربات کو جنم دے کر اچھے اچھوں کو مُرغِ بسمل کی طرح تڑپنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایسے

حالات میں اگر اپنے ہی طوطا چشم نکلیں گے تو دکھ اور اذیت بھلا کیوں نہ دو چند ہو میر کی زندگی کا مطالعہ ہمیں اس حقیقت سے آشکار کرتا ہے کہ وہ محولہ بالا سبھی مسائل سے بری طرح گھائل تھے ایسے میں ان کے الفاظ میں غم و یاس کا در آنا فطری عمل تھا انہیں اس بات کا نہ صرف شدت سے احساس تھا بلکہ اس کا اظہار ان درجنوں بھرا شعار میں ملتا ہے۔ کہ زمانے نے ان کی ناقدری کی ہے اور انہیں افلاس اور لاچارگی کی چوکھٹ کا غلام بنا دیا ہے اس قسم کے اشعار میں کبھی وہ اپنی عزت کا رونا روتے ہیں۔ تو کبھی انہیں دوسرے کی خوش حالی بے قرار کرتی ہے۔ بعض اوقات وہ موازنے کی فضا پیدا کرتے ہوئے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے جس میں گنج قاروں نے سماں ہی باندھ دیا ہے:

گنج قاروں کا سا یاں کس کے کنے تھا سو تو میرؔ
خاک میں ملتا ہے اب تک اپنے مال و زر سمیت(۱۳)

جامِ جم یا جامِ جمشید کی تلمیح اردو غزل میں معروف ہے اور تقریباً ہر شاعر کے کلام میں اس کا استعمال پڑھنے کو ملتا ہے:

''جامِ جم کا دوسرا نام جامِ جام جہاں نما بھی ہے۔ جمشید ایران کا ایک بادشاہ گزرا ہے کہ اس نے ایک ایسا جام تیار کیا تھا جس میں ساری دنیا نظر آتی تھی کہتے ہیں کہ اس میں ساری دنیا کا نقشہ بنا ہوا تھا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں خطوط و دوائر و ہندی اضطرلاب بنے ہوئے تھے جن سے ستاروں کی بلندی وغیرہ اور دنیا کے امور خیر و شر کا پتہ چل جاتا تھا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمشید نے شراب ایجاد کی تھی اس لئے اس کا جام جمشید مشہور ہے۔''(۱۴)

میر نے اس تلمیح کو اپنی غزلیات میں نئے نئے اور تازہ و تازہ دلفریب رنگوں میں پیش کیا ہے وہ کبھی جامِ جمشید سے قسمت کا حال بتانے والا پیالہ لیتے ہیں تو کبھی ان کا متخیلہ اس پیالے کو کو شراب کی ایجاد اور ایرانی زندہ دل محبتوں سے تعبیر کرتا ہے:

جمشید جس نے وضع کیا جام ، کیا ہوا
وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے ناؤ نوش(۱۵)

عشق اس کارخانۂ ہستی کو چلانے والا ہے وہ کام اور عمل جو انسانی سوچ کے دائرہ کار سے باہر ہوں عشق کا جذبہ سے یوں آسانی و روانی سے سرانجام دیتا ہے جیسے کوئی کھیل تماشا ہو۔ اس پر کمال یہ کہ میر جیسے شخص کے لئے تو عشق رگ رگ میں سمائے اور گردش کرتے ہوئے خون کی مانند ہے کہ یہی درس اسے اپنے والد سے ملا تھا:

''بیٹا عشق کرو عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کو چلانے والا ہے عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا کمال ہے عشق ہی بناتا ہے عشق ہی جلا کر کندن کرتا ہے جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔''(۱۶)

غزلِ میرؔ کا قاری اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ ان کا کلام عشاق کی قربانیوں کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں عشق مجازی کی صورت میں بھی ان کے اظہار میں شامل ہوتا ہے تو حقیقت کی طلب کی بلندی بھی اس میں دیکھی جا سکتی ہے منصور کی تلمیح کرتے ہوئے کس خوبصورتی سے ان کی قلبی واردات کو الفاظ کا ایک پیرہن عطا کیا ہے کہ شعر جمالیاتی مرقع بن گیا ہے:

منصور نے جو سر کو کٹایا تو کیا ہوا
ہر سر کہیں ہوا ہے سزاوار عشق کا(۱۷)

کسی بھی بڑے شاعر ادیب کی یہ پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنے مشاہدہ اور بیان اور ودیعت کی شاعرانہ صلاحیت سے عام سے عام مضمون کو بھی غیر معمولی حد تک دلفریب اور معنی سے بھرپور بنا دیتا ہے۔ نسبتاً کم درجہ کے فن کاروں اور لافانی تخلیق کاروں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ ایک اچھوتے مضمون کو بھی پھسپھسی تجسیم کاری کرتا تو دوسرا معمولی اور روایتی بات کو بھی انفرادیت عطا کر دیتا ہے۔ میر کے جس کی شاعرانہ پختگی اور میرؔ کہ جس کی شاعرانہ پختگی اور اُستادی کا اعتراف ہر دور کے معتبر ناقدین نے کیا ہے، عام سے عام موضوع کو یکتائی عطا کر دیتے ہیں۔ احمد فاروقی کے بقول:

''میر کے کلام کی دل آویزی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے واردات اور حالات کو اپنے پرتاثیر دلنشیں اور انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے اور بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔''(۱۸)

دیکھیے کوہکن کی روایتی تلمیح سے کیسا رنگ اور مضمون نکالا ہے کہ دل خود بخود داد دینے کو چاہتا ہے:

ہم نے تو ناخنوں سے منہ سارا نوچ ڈالا
اب کوہ کن دکھاوے رکھتا ہے گر ہنر کچھ(۱۹)

میر کی ہنرمندی ہے کہ وہ شعر کو تجربہ گاہ بنا کر بھی اس کی شعریت کو مرنے نہیں دیتے مثلاً وہ اپنے اشعار کو سجانے سنوارنے کی تلمیحات کا استعمال تو کرتے ہی ہیں انہیں اس بات میں بھی خوب مہارت ہے کہ وہ ایک شعر تلمیحات کا پورا منظّم نظام یکجا کر لیتے ہیں۔ درج ذیل شعر کی ہی مثال لیں تو اس میں شاعر نے 'شیریں'، 'کوہ کن' جیسی تلمیحات لا کر چند الفاظ میں ایک طویل تاریخی واقعے کی مکمل جزئیات پیش کی ہیں کہ شعر میں ترتیب کا عمدہ حوالہ بن گیا ہے:

نقش شیریں یادگار کوہ کن ہے اس میں خوب
ورنہ کیا ہے بیستوں دیکھا ہے میں کہسار کو(۲۰)

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کلام میر کو جو اس قدر پذیرائی اور مرتبہ حاصل ہوا ہے اس کے دیگر کئی اسباب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی غزلیات کا تلمیحاتی نظام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تلمیحات اپنے اندر اس قدر وسعتِ جہانِ معنی، بے ساختگی اور ربط رکھتی ہیں کہ اس پر ایک بھرپور سندی مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ ان کے اشعار میں تلمیحات کا استعمال دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی ماہر نقاش نے پورے ارتباط کے ساتھ حسن کی گل کاری کی ہو۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات جلد دوم، لاہور: جامع اللغات کمپنی، س ن، ص: ۲۳۷
۲۔ نورالحسن نیر، مولوی، نور اللغات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۰ء، ص: ۲۷۵
۳۔ مہذب لکھنوی، مہذب اللغات، جلد سوم، لکھنؤ: سرفراز قومی پریس، ۱۹۶۲ء، ص: ۲۹۶
۴۔ میر تقی میر، کلیات میر، جلد دوم، مرتبہ: کلب علی خان فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۹۱ء، ص: ۵۶
۵۔ ایضاً، ص: ۱۱۷

۶۔ میر تقی میر، کلیات میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خان فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء، ص: ۴۴۰
۷۔ ایضاً، ص: ۴۷۱
۸۔ شریف احمد قریشی، ڈاکٹر، تلمیحات نظیر اکبر آبادی، نئی دہلی: علی شوبی آفسیٹ پریس، ۲۰۰۶ء، ص: ۲۲۸
۹۔ میر تقی میر، کلیات میر، جلد دوم، مرتبہ: کلب علی خان فائق، ص: ۴۷
۱۰۔ میر تقی میر، کلیات میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خان فائق، ص: ۹۹
۱۱۔ میر تقی میر، کلیات میر، جلد دوم، مرتبہ: کلب علی خان فائق، ص: ۱۴۵
۱۲۔ ایضاً، ص: ۲۹۷
۱۳۔ ایضاً: ص ۱۱۱
۱۴۔ مصاحب علی صدیقی، ڈاکٹر، اردو ادب میں تلمیحات، لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۹۰ء، ص: ۲۵۹
۱۵۔ میر تقی میر، کلیات میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خان فائق، ص: ۲۶۴
۱۶۔ میر تقی میر، نقد میر، ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۷۷
۱۷۔ میر تقی میر، کلیات میر، جلد دوم، مرتبہ: کلب علی خان فائق، ص: ۱۱
۱۸۔ احمد فاروقی، خواجہ، میر تقی میر حیات اور شاعری، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۵ء، ص: ۳۰۰
۱۹۔ میر تقی میر، کلیات میر، جلد دوم، مرتبہ: کلب علی خان فائق، ص: ۲۷۲
۲۰۔ میر تقی میر، کلیات میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خان فائق، ص: ۳۹۰

☆.....☆.....☆